سید نصیر شاہ

معتزلہ

جب یونانی فلسفہ اور منطق نے اسلام کے خلاف صف آرائی کی تو مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جنھوں نے مخالفین کی اس فوج کو شکست دی اور علمی و فکری دنیا میں بھی اسلام کی عظمت کی دھاک بٹھا دی۔ معتزلہ سے پہلے اسلامی تاریخ میں کسی ایسے فرقہ کا سراغ نہیں ملتا جو ماوراء الطبیعی مسائل میں عقلی و علمی انداز سے زبان کھولتا ہو۔ معتزلہ کو اس بارہ میں اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔ کتنے علوم ہیں جو محض اسی فرقہ کی وجہ سے عالمِ وجود میں آئے۔ کتنے عقائد ہیں جو آج تک ہم میں رائج ہیں مگر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ کن لوگوں کی نکتہ سنجیوں نے یہ نکات کھولے۔

اعتزال کی تاریخ

اسلام جب تک جزیرۂ عرب میں رہا مسلمانوں کو فلسفہ و منطق سے کوئی لگاؤ نہ تھا کیونکہ عرب کا اصلی مذاق فکر نہیں عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کے مسائل پر تو بہت کچھ تحقیق ہو چکی تھی لیکن "ایمانیات" سے متعلق کچھ زیادہ عرق ریزی نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ اجمالی عقائد کافی سمجھے گئے تھے۔ لیکن جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو ایرانی، یونانی اور دوسری قومیں اسلام کی حلقہ بگوش ہونے لگیں۔ ان لوگوں کے قدیم مذاہب میں خدا، صفاتِ خداوندی، قضا و قدر اور جزا و سزا کے متعلق خاص عقائد تھے۔ ان عقائد میں سے جو عقیدے صریحاً اسلام کے مخالف تھے ان کے بُرے اثرات

تو ان کے دماغوں سے نکل گئے لیکن جہاں اسلامی عقائد کے کئی پہلو ہو سکتے تھے اور کچھ خیالات ان کے قدیم عقائد سے مشابہت رکھتے تھے وہاں بالطبع وہ انہی خیالات و افکار کی طرف مائل ہو گئے۔ مثلاً یہودیوں کے ہاں خدا کو مجسم تصور کیا جاتا تھا جب وہ مسلمان ہوئے تو قدرتی طور پر وہ ان ہی آیات کو مدارِ ایمان قرار دینے لگے جن میں اللہ تعالیٰ کی نسبت ہاتھ اور منہ وغیرہ کے سے الفاظ موجود ہیں۔ پھر یہ نومسلم صدیوں سے فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکتہ آفرینیوں کے عادی تھے اس لیے انھوں نے علمی مباحثوں کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی نصرانی، زردشتی اور یہودی علماء نے جو فلسفہ و منطق سے واقف تھے مسلمانوں سے علمی مناظروں کا آغاز کر دیا۔ ایسے مناظروں کا گہوارہ عراق تھا کیونکہ وہاں مختلف قوموں کے لوگ جمع تھے۔ اب ایسے ایسے عقائد و معاملات میں گفتگوئیں شروع ہو گئیں جن کے متعلق محدثین زبان تک ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ فی الواقع یہ وقت اسلام کے لیے بڑا ہی نازک وقت تھا اور پھر جب سریانی، یونانی، پہلوی اور ہندی زبانوں سے حکمت و فلسفہ کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور لوگوں میں فلسفیانہ مذاق پھیل گیا تو جیسے سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ قرآن کی آیات اور اسلامی عقائد کو غیر مسلموں نے ہدف بنا لیا اور اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ محدثین اور فقہاء صرف روایات کی مدد سے اس سیلِ بے پناہ کا مقابلہ کرنے نکلے مگر یہ ان کا میدان نہیں تھا، اور یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی کہ ان لوگوں کے اعتراضات کا جواب دے سکیں کیونکہ ان کا سارا علم منقولات تک محدود تھا۔ اور مقابلہ بھی ان لوگوں سے آپڑا تھا جو نہ قرآن کو مانتے تھے نہ احادیث کو۔ فکری گمراہی کا منہ زور طوفان حصارِ اسلام کی بنیادوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ انہی لوگوں کے ہتھیاروں سے انھیں شکست دی جاتی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ معترضین کے مذاہب اور ان کے فلسفہ سے پوری واقفیت ہوتی۔ الحاد کے اس "سیلِ سبک سیر و زمیں گیر" کا مقابلہ کرنے کے لیے معتزلہ میدان میں آئے۔ وہ حریفوں کے مقابلہ میں ہر طرح سے فائق

تھے۔ انھوں نے اپنے زورِ بیان اور عقلی دلائل سے اعدائے اسلام کو شکست دی اور اپنے دور کے علوم کے مطابق قرآن حکیم کی عقلی تفسیر پیش کر کے دشمنانِ اسلام کی زبانیں گنگ کر دیں۔ معتزلہ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھ کر ملک کے اطراف و اکناف میں پھیلا دیں۔ اس طرح اسلامی فکر دور دراز گوشوں تک پہنچ گیا۔ معتزلہ کو ایک فرقہ کی حیثیت بعد میں دیدی گئی۔ یہ درحقیقت وہ مسلمان تھے جو دین کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرنے کا جذبہ لیکر اٹھے تھے۔

جبر و قدر کے مسئلہ کو اعتزال کا اولیں مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ ملوکیت میں عوام جن مظالم کا شکار تھے انھیں جائز ثابت کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اسے اپنے کسی فعل پر اختیار نہیں جو کچھ وہ کرتا ہے اس کا ذمہ دار خود انسان نہیں ہے کیونکہ ہر آدمی کی تقدیر لکھ دی گئی ہے۔ سب سے پہلے معبد جہنی نے اس مسئلہ کی تردید کی اور انسان کو اپنے افعال پر مختار تسلیم کیا۔ اس طرح مذہبِ قدر کی بنیاد پڑی۔ معبد علانیہ حکومت کی مخالفت کرتا تھا اس لیے عبدالملک بن مروان نے ۸۰ھ میں اسے حجاج کے ہاتھوں قتل کرا دیا۔

معبد کے بعد غیلان دمشقی نے اسی مذہب کو اپنایا اور چند اور مسائل بھی مذہبِ اعتزال میں شامل کر لیے جن میں سے امر بالمعروف کا مسئلہ حکومت کے لیے انتہائی پُرخطر مسئلہ تھا۔ آخر ہشام بن عبدالملک نے ۱۰۵ھ میں اسے دمشق بلا کر پھانسی دیدی۔

لیکن مذہبِ اعتزال کو اب سینکڑوں لوگ قبول کر چکے تھے اور اس کے اصول بھی مرتب ہو گئے تھے۔ ۸۰ھ میں عمرو بن عبید اور واصل بن عطا پیدا ہوئے جنھیں مذہبِ اعتزال کے رکنِ رکین کہنا چاہیے۔ دونوں صاحبِ فضل و کمال تھے۔ ان کی نکتہ آفرینیوں سے اعتزال کو بہت عروج ملا حتیٰ کہ یزید بن ولید بن عبدالملک نے علانیہ یہ مذہب قبول کیا۔ جب ولید بن یزید عیاشیوں میں ڈوب گیا تو یزید نے مذہبِ اعتزال کے پانچویں اصول امر بالمعروف پر عمل پیرا ہو کر بغاوت کا علم بلند کیا اور ہزاروں معتزلہ اس کے ساتھ ہو گئے۔ ولید قتل ہو گیا اور یزید کو فتح حاصل ہوئی۔

اب گویا اعتزال کے قدم تختِ سلطنت پر بھی پہنچ گئے۔ ۱۳۲ھ میں خلافتِ بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

عباسی خاندان کا دوسرا بادشاہ منصور اگرچہ کسی مذہب سے منسوب ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ عمرو بن عبید اس کا بچپن کا ساتھی تھا، دونوں نے ایک مدت تک اکٹھی تعلیم حاصل کی تھی، اس کے علاوہ وہ عمرو بن عبید کی حق گوئی، جرأتِ ایمانی اور زہد و قناعت کا بھی معترف تھا اس لیے اس کے زمانہ میں معتزلہ کو بہت عروج حاصل ہوا۔

منصور کے بعد مہدی نے مذہبی آزادی کو روک دیا۔ اس کے بعد ہارون الرشید تخت نشین ہوا۔ وہ خود تو فلسفہ و حکمت سے ناواقف تھا لیکن دربار برامکہ کے ہاتھ میں تھا اس لیے اعتزال کو عروج نصیب ہوتا گیا۔ ہارون کے بعد مامون آیا تو معتزلہ کی بن آئی کیونکہ اس نے خود یہ مذہب قبول کر لیا۔ مامون خود بھی بہت بڑا فاضل تھا اور ابوالہذیل و نظام جیسے آفتاب و ماہتاب بھی اس کے دربار میں موجود تھے اس لیے اعتزال کا مہرِ اقبال نصف النہار پر چمکنے لگا۔ نظام کے بعد اس کے فاضل شاگرد جاحظ نے بھی مذہبِ اعتزال کو بہت وسعت دی۔

مامون کے بعد معتصم اور واثق یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ وہ دونوں معتزلی تھے۔ مشہور معتزلی احمد بن داؤد ان کے زمانہ میں قاضی القضاۃ رہے جنھیں ایک واسطہ سے واصل بن عطاء کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ ان کے زمانہ میں اعتزال کو اور زیادہ قوت حاصل ہوئی۔

واثق کے بعد متوکل نے عقلی و فکری ترقی کو روک دیا لیکن چوتھی صدی ہجری تک اس مذہب کو پوری قوت حاصل رہی۔ بڑے بڑے متکلم، مفسر اور ادیب پیدا ہوئے۔ سب سے آخر میں ابوعلی جبائی تھے ان کے بعد کوئی بلند پایہ امام الاعتزال پیدا نہ ہوا۔

علامہ بشاری نے چوتھی صدی ہجری میں دنیا کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے مندرجہ ذیل مقامات میں معتزلہ کی نسبت یہ تفصیل لکھی ہے:

"سروات اور حرمین کے سواحل اور خصوصاً عمان کے تمام باشندے معتزلی ہیں عراق

میں حنبلیوں اور شیعوں کا غلبہ ہے تاہم معتزلہ بھی موجود ہیں۔ اقور کے موضع عانتہ میں معتزلہ کی کثرت ہے۔ فسطاط میں معتزلہ کا بڑا زور ہے۔ خراسان کے دیہات میں بھی ان کی کثرت ہے۔ فارس اور سیر جان میں اکثر معتزلہ ہیں اور کرمان میں تمام دنیا کی نسبت معتزلہ زیادہ ہیں۔"

چوتھی صدی ہجری میں ہی معتزلہ پر ہولناک مظالم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ محمد بن احمد (متوفی ۴۷۸ھ) جو بہت بڑے معتزلی عالم تھے پچاس سال تک گھر سے نہ نکل سکے۔ علامہ زمخشری جن کی تفسیر کشاف گھر گھر پھیلی ہوئی ہے معتزلی ہونے کی وجہ سے ملک میں چین سے نہ رہ سکے اور مجبوراً مکہ چلے گئے۔

ساتویں صدی ہجری میں مغلوں اور ترکوں نے بغداد اور دوسرے بڑے بڑے شہروں کو تباہ کر کے مسلمانوں کی علمی و عقلی قوتوں کا بھی استیصال کر دیا اور اعتزال جیسا نازک مذہب تو ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ ترک قلم کی بجائے تلوار کے دھنی تھے اور اعتزال جیسے دقیق مذہب کو قلم سے زیادہ مناسبت تھی اس لیے ترکوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی یہ مذہب زندہ نہ ہو سکا۔

معتزلہ کے عقائد

معتزلہ کے اجمالی تعارف کی یہ کوشش ناکام رہے گی اگر مجمل طور پر ان کے عقائد بیان نہ کیے جائیں۔ معتزلہ کے عقائد میں یہ اصول مبادیات کی حیثیت رکھتے ہیں:

(۱) توحید (۲) عدل (۳) قدر (۴) وعد و وعید (۵) المنزلۃ بین المنزلتین (۶) امر بالمعروف۔

توحید

اگرچہ مسلمانوں کے تمام فرقے اللہ تعالےٰ کو واحد لاشریک تسلیم کرتے ہیں مگر پھر بھی خدا کے تصور میں اختلافات رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔

ظاہریہ اور مشبہہ کا مذہب ہے کہ اللہ جسمانی ہے۔ عرش پر متمکن ہے۔ اس کے ہاتھ ہیں، چہرہ ہے۔ سرورِ کائنات صلعم کے دوشِ مبارک پر اللہ نے ہاتھ رکھا اور آپؐ نے اس ہاتھ کی ٹھنڈک محسوس کی۔

عام اربابِ روایت کے نزدیک خدا جسمانی ہے۔ اس کے ہاتھ ہیں۔ منہ ہے۔ پنڈلیاں ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں ایسی نہیں جیسی ہماری ہیں۔ وہ عرش پر بیٹھا ہے۔ کرسی پر پاؤں رکھے ہیں، اور کرسی ان کے بوجھ سے چرچراتی ہے۔

معتزلہ کے نزدیک خدا کی ذات زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی جہت نہیں جس کی طرف اشارہ کر کے کہا جا سکے کہ خدا اس طرف ہے۔ وہ مجسم نہیں۔ قرآن میں جہاں اس کے ہاتھ اور چہرے کا ذکر آیا ہے وہاں حقیقت نہیں بلکہ مجاز مراد ہے۔ کسی زمانہ میں اس قول کو کفر کا ہم پلہ خیال کیا جاتا تھا لیکن آج غالباً سب ہی لوگ اس قول میں معتزلہ سے متفق ہیں۔

صفات

توحید کے ساتھ ہی مسئلۂ صفات کا تعلق ہے۔ مدتوں یہ مسئلہ باعثِ نزاع رہا کہ:

ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات

محدثین اور فقہاء کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے الگ اور قدیم ہیں۔ معتزلہ کہتے تھے کہ اس طرح تو بہت سے خدا ہوئے اور تعدد لازم آیا۔ پھر ذات اور صفات کی علاحدگی میں ایک اور مشکل بھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر صفات ذات سے الگ ہوں تو کسی صفت کی غیر موجودگی میں بھی ذات باقی رہتی ہے۔ جیسے انسان کی صفات میں اگر صفتِ سماعت موجود نہ ہو تب بھی اسے انسان کہا جائے گا۔ لیکن اگر خدا (فرض کرو) صفتِ خالقیت سے محروم ہو تو اسے خدا نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وہ دلائل تھے جن کی بنا پر معتزلہ صفاتِ ذات کو عینِ ذات سمجھتے تھے۔ وہ اس کے استدلال میں وہ

آیات پیش کرتے تھے جن سے تنزیہ ثابت ہوتی ہے۔

عدل

توحید کے بعد ان کا دوسرا عقیدہ عدل تھا۔ تمام اسلامی فرقے بحیثیت مجموعی خدا کو عادل تسلیم کرتے ہیں لیکن معتزلہ اس سلسلہ میں چند خاص تشریحات سے کام لیتے تھے۔

اشعریہ کا عقیدہ تھا کہ خدا محالات کا حکم دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔ لیکن معتزلہ اس کے مخالف تھے ان کا خیال تھا کہ محالات کا حکم دینا عدلِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اور جب خدا کو عادل تسلیم نہ کیا جائے تو لامحالہ اسے ظالم کہنا پڑے گا اور یہ اللہ کی شان کے خلاف ہے۔ ماتریدیہ بھی اس معاملہ میں معتزلہ کے عقائد سے متاثر ہیں۔

اشعریہ یہ بھی کہتے تھے کہ کوئی چیز فی نفسہٖ نہ اچھی ہے نہ بُری۔ خدا جس چیز کو اچھا کہہ دے اچھی ہے جسے بُرا کہہ دے بُری ہے۔ اس کے خلاف معتزلہ کا خیال تھا کہ خدا اسی چیز کو اچھا کہتا ہے جو اصل میں اچھی ہو اور اسی کو بُرا کہتا ہے جو اصل میں بُری ہو۔ ماتریدیہ نے معتزلہ کا یہ عقیدہ بھی قبول کیا ہے۔

اشعریہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ خدا کے لیے عدل و انصاف کرنا ضروری نہیں۔ وہ چاہے تو عبادت کے عوض عذاب دے دے اور چاہے تو گناہ کے بدلہ میں انعام دے دے۔ معتزلہ اس نظریہ کے بھی سختی سے مخالف ہیں۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ عدل و انصاف خدا کے لیے ضروری ہے۔ عبادت کے عوض عذاب اور گناہ کے عوض انعام دینا ظلم ہے۔ اور خدا ظلم نہیں کر سکتا کیونکہ ظلم نقصِ بشریت ہے اور اللہ نقائص سے پاک ہے۔ ماتریدیہ نے بھی اس عقیدہ کو اپنے مذہب میں شامل کر لیا۔

قدر

انسان اپنے افعال میں مجبورِ محض ہے یا مختارِ مطلق؟ یہ سوال اس وقت سے انسانی ذہن کے لیے وجہِ اضطراب بنا ہوا ہے جس وقت سے اس نے سوچنا شروع کیا ہے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو مسئلہ میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانی افعال کی جزا و سزا مقرر کر دی ہے تو لازماً انسان مجبور نہیں کیونکہ مجبور کو سزا دینا خدا کی صفتِ عدل کے خلاف ہے۔ آخر یہ کیسے جائز ہے کہ کسی آدمی کو وہ خود ہی چوری کرنے پر مجبور کرے اور پھر اسے چوری کی سزا بھی دے۔ اگر عقیدۂ جبر کو تسلیم کیجیے تو قیامت اور حشر نشر سب عقائد بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس واضح بات کی بنا پر معتزلہ نے قدر کا راستہ اختیار کیا ہے اور انسان کو اپنے افعال میں مختار تسلیم کیا ہے۔ لیکن قرآنِ حکیم میں بعض ایسی آیات بھی ہیں جنھیں اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ انسان کے افعال بھی اللہ کے پیدا کردہ ہیں اور انسان مجبور ہے۔ معتزلہ ان تمام آیات کا یہ جواب دیتے ہیں کہ انسان کو چونکہ تمام توتیں اللہ نے عطا کی ہیں اس لیے ان افعال کی نسبت اللہ کی طرف جائز ہے۔ جیسے ہم یہ کہنے کی بجائے کہ "سورج کی گرمی گندم کے خوشوں کو پکاتی ہے" یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "اللہ گندم کے خوشوں کو پکاتا ہے"۔ بعض آیات میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ نے کفار کے دلوں پر مہریں کر دی ہیں۔ جبریہ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ جب دلوں پر اللہ ہی نے مہریں کر دی ہیں اور وہ حق پر غور نہیں کر سکتے تو گویا اللہ نے انھیں کفر پر مجبور کر دیا ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ انسان کے ہر فعل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ انکار و جحود اور ضد و سرکشی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے کان حق کی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اس کا ذہن صداقت کی دعوت پر غور و فکر نہیں کرتا۔ پس ختمِ قلوب اصل میں انکار و جحود کا لازمی نتیجہ ہے اور اس کے باوجود انسان کو یہ اختیار ہے کہ وہ دعوتِ حق و صداقت پر فکر و تدبر کر کے اپنے دل کے قفل کھول دے۔ گویا جہاں ضد کے فعل کا نتیجہ ختمِ قلب ہے وہیں ضد چھوڑ دینے کا یہ نتیجہ بھی تو ہے کہ انسان میں حق قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آخر آیہ ان الذین کفروا سواء علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرہم لا یؤمنون o ختم اللہ

علیٰ قلوبہم وعلیٰ سمعہم وعلیٰ ابصارہم غشاوۃ ۔ کے نزول کے بعد بھی تو کفار ایمان لاتے رہے ہیں ۔ پس اگر اس کا وہی مفہوم ہوتا جو جبر یہ لیتے ہیں تو پھر وہ لوگ بعد میں ایمان کیوں لاتے جب کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی تھیں ۔ فی الواقع ایسی تمام آیات کا مفہوم یہی ہے کہ جب تک کفار ہٹ دھرمی اور ضد پر جمے رہیں حق ان پر اثر انداز نہیں ہوتا اور ان کی تقدیر یہی ہوتی ہے کہ ان کی بصارت پر باطل پردے تان دیتا ہے اور وہ نظام حق کے تابناک نتائج دیکھ نہیں سکتے ۔ لیکن جب وہ اپنی حالت بدل لیں ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ دیں تو ظاہر ہے کہ اس فعل کے بُرے نتائج بھی خود بخود ختم ہو جاتے ہیں ۔ گویا انسان اپنی حالت بدل لے تو اس کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے :

رمز باریکے بحرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی او دیگر است
شبنمی! افتندگی تقدیر تست — قلزمی! پائندگی تقدیر تست
خاک شو تا ذرہ ہوا سازد ترا — سنگ شو بر شیشہ انداز د ترا

وعد و وعید

معتزلہ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس عمل کے لیے جو وعدہ یا وعید بیان کی گئی ہے اس کا نافذ ہونا ضروری ہے ۔ محض ڈراوے یا ترغیب کے لیے خدا کچھ نہیں بیان کرتا ۔ نہ وہ "موج میں آکر" انسانوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور نہ غصہ میں آکر فرمانبرداریوں پر پانی پھیر دیتا ہے ۔ ہر عمل کا نتیجہ مقرر ہے اور وہ مرتب ہو کر رہے گا ۔ اشعریہ اس کے مخالف ہیں ۔

المنزلۃ بین المنزلتین

معتزلہ سے پہلے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو اہل روایت کافر کہتے تھے اور مرجیہ اسے مسلمان سمجھتے تھے ۔ معتزلہ نے کہا وہ نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ اس کی حالت دونوں کے بین بین ہے ۔ اسے فاسق کہا جا سکتا ہے ۔

امر بالمعروف

خوارج اس اصول کو فرضِ عین قرار دیتے تھے اور ہمیشہ شمشیر بکف رہتے۔ لیکن معتزلہ اسے فرض سمجھتے تھے۔ وہ تلوار اٹھانا اس وقت ضروری سمجھتے جب حالات سازگار ہوتے اور سارے سامان جمع ہو جاتے۔

عقل کا غلبہ

معتزلہ عقل کی فضیلت کے قائل تھے۔ وہ عقل کو احادیث پر حاکم سمجھتے تھے۔ جو حدیث عقل و درایت کے خلاف ہوتی اسے موضوع قرار دیتے۔ اس اصول کو وضع کرنے کا بڑا سبب غالباً ان لوگوں کا غلو اور جمود تھا جو حدیث کے سامنے عقل کو حقیر سمجھتے تھے اور جو چیز بھی حدیث کے نام پر ان کے سامنے پیش ہوتی وہ اسے بے تامل قبول کر لیتے۔ ان لوگوں کے جمود کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ہارون کے دربار میں کسی نے یہ حدیث پڑھی کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام میں مناظرہ ہوا۔ ایک شخص بول اٹھا کہ آدمؑ اور موسیٰؑ کے زمانوں میں تو صدیوں کا بُعد ہے۔ پھر وہ اکٹھے کیونکر ہوئے اور مناظرہ کیسے چھڑ گیا۔ ہارون جو محدثین کا ہم خیال تھا اس قدر برہم ہوا کہ اس شخص کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔

ذیقین کا تشدد

معتزلہ نے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی تو محدثین نے نہایت زور شور سے اس کی مخالفت کی امام شافعی، امام احمد بن حنبل، سفیان ثوری، اور تمام اہل حدیث نے اس علم کا حصول حرام قرار دیدیا۔ امام غزالی لکھتے ہیں:

"والی التحریم ذہب الشافعی و مالک و احمد بن حنبل و سفیان و جمیع اہل الحدیث

من السلف۔" (احیاء العلوم)

امام شافعی کہتے تھے کہ متکلمین کو دُرّے لگانے چاہئیں۔ امام احمد بن حنبل کا قول تھا کہ متکلمین زندیق ہیں۔ معمولی معمولی اختلافات میں تشدد کا یہ عالم تھا کہ فریقین ایک دوسرے کو کافر ٹھہراتے تھے۔

اختلافی مسائل میں ایک یہ بھی تھا کہ "قرآن قدیم ہے یا مخلوق وحادث؟" معتزلہ کہتے تھے کہ خدا کی صفتِ تکلم قدیم ہے لیکن جو الفاظ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتے تھے وہ مخلوق وحادث تھے۔ محدثین کلام اللہ کو ہر حال میں قدیم تسلیم کرتے تھے۔ زیادہ غور و تفحص سے کام لیا جائے تو دونوں کا حاصل ایک ہی ٹھہرتا ہے لیکن فریقین نے اس مسئلہ کو کفر و اسلام کی حدِ فاصل قرار دیدیا، اور تشدد اس انتہا کو پہنچا کہ جعد بن درہم کو کوفہ کے والی خالد بن عبداللہ القسری نے اسی جرم کی پاداش میں گرفتار کر کے عید قربان کے موقع پر حصولِ ثواب کی نیت سے ذبح کیا اور جب معتزلہ کو موقع ملا تو محدثین کو سخت سزائیں دی گئیں۔ حتیٰ کہ مامون کا زمانہ محدثین کے لیے ایک عبرت ناک دورِ ابتلا ثابت ہوا۔ مگر متوکل کے زمانہ میں محدثین نے بھی بڑھ چڑھ کر معتزلہ سے انتقام لیا۔

کیا معتزلہ کافر تھے؟

ایک عرصہ تک معتزلہ کو کافر سمجھا جاتا رہا لیکن جب فضا ذرا پُرسکون ہوئی اور معتزلہ کی علمی خدمات پر نظر ڈالی گئی تو محققین نے انھیں کافر کہنے سے انکار کر دیا۔

علامہ جلال الدین دوانی لکھتے ہیں:

"رہے معتزلہ تو صحیح یہی ہے کہ وہ کافر نہیں ہیں" (شرح عقائد عضدی)

مشہور محدث علامہ تقی الدین سبکی لکھتے ہیں:

"یہ دونوں گروہ اشعریہ اور معتزلہ برابر کے جوڑ ہیں اور دونوں متکلمین کے سرگروہ ہیں اور اشعریہ زیادہ اعتدال پر ہیں۔" (شرح احیاء الاسلام)

علامہ رازی فرماتے ہیں :

"میرے والد ماجد شیخ القاسم انصاری کا یہ قول بیان کیا کرتے تھے کہ اہل سنت کا خیال خدا کی قدرت کی وسعت پر ہے، اور معتزلہ کی نظر خدا کی تعظیم اور مبرا عن العیوب ہونے پر ہے۔ اس لیے غور سے دیکھو تو دونوں خدا کی عظمت و تقدیس کے معترف ہیں۔ البتہ اس قدر ہے کہ کسی نے غلطی کی اور کوئی صائب الرائے ٹھہرا۔" (تفسیر کبیر۔ سورہ الانعام)

مشہور محدث امام نووی فرماتے ہیں :

"سلف و خلف کا اس پر برابر اتفاق رہا کہ معتزلہ وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔" (فتح المغیث ص ۱۴۲)

فقہی حیثیت سے معتزلہ اکثر حنفی المذہب ہوتے تھے۔ طبقات الحنفیہ میں جہاں ان کے نام آتے ہیں تو ان کا تذکرہ بھی اُسی عظمت و شان سے کیا جاتا ہے، جس طرح دوسرے علمائے حنفیہ کا۔ علامہ زمخشری مشہور معتزلی ہیں۔ ان کی تفسیر کشاف ادب، عربیت، معانی اور بلاغت کی بے مثال خوبیوں کے باعث آج تک نصاب میں داخل ہے۔ ان کے متعلق طبقات الحنفیہ میں لکھا ہے کہ "من اکابر الحنفیۃ"۔ یعنی وہ اکابر حنفیہ میں سے تھے۔ فنِ بلاغت کے تمام ارکان یعنی جاحظ، سکاکی اور عبدالقادر جرجانی معتزلی تھے۔

معتزلہ نے اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق قرآنِ حکیم کی عقلی تفسیر پیش کی اور ثابت کر دیا کہ قرآنِ حکیم میں جو کچھ مذکور ہے، علم و عقل کے مطابق ہے۔ معتزلہ مفسرین میں سے ابومسلم اصفہانی، ابوبکر اصم، ابوالقاسم بلخی، علامہ زمخشری اور قفال کبیر بہت معروف ہیں۔